قفسِ رنگ

غیاث صدیقی

اشاعت اول ۱۹۷۶ء
ایک ہزار

بہ تعاون ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد و ایچ، ای، ایچ، دی نظامس ٹرسٹس
کتابت : محمد ولی الدین خوشنویس،
طباعت : اکسل فائن آرٹ، جامع مسجد
محبوب چوک، حیدرآباد (اے پی)

قیمت : پندرہ روپے سکۂ ہند ۱۵

ناشر: انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد

ملنے کے پتے

- اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، روبرو اے جی آفس
- غیاث صدیقی بتوسط امجد صدیقی :-

مجاہد منزل، کالی کمان (۲۲ - ۵ - ۲۴۲)
حیدرآباد نمبر ۵۰۰۰۰۲، اے پی

انتساب

اُردو کے دو سچے خدمت گذاروں،

جناب **عابد علی خاں** ــــ اور

جناب **محبوب حسین جگر** کے نام

جن کی بے مثال دوستی نے اُردو کو بہت کچھ دیا ہے

غیاث صدیقی

خاکِ دکن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

قُمری کفِ خاکستر و بُلبُل، قفسِ رنگ
اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے۔

(غالبؔ)

ترتیب

نظمیں ۲۵ تا ۴۰

غزلیں ۴۱ تا ۴۸

درونِ خانہ ۴۹ تا ۷۱

ترجمے ۸۳ تا ۱۱۱

نذرِ وطن ۱۱۳ تا ۱۲۸

غیاث صدیقی نئے عہد کے مسائل اور احساسات کو نئی زبان اور نیا بیان عطا کرنے کی قدرت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی نفاست اور نئی نزاکت کا پورا شعور رکھتے ہیں۔
اس لیے ان کا قلم غزل اور آزاد نظم دونوں میدانوں میں جولانیاں دکھاتا ہے۔ میں نے اُن کا کلام پڑھا ہے اور وہ شاعر کی خوش فکری اور خوش بیانی پر شاہد ہے اُس میں ایک ذہنی وسعت اور بالیدگی ہے۔ مغربی ادب سے ذوق و شوق نے ان کے فن پر اور بھی جلا کردی ہے۔ میں اُن کے نئے مجموعوں کا منتظر اور ان کا خیرمقدم کرنے کے لیے چشم براہ ہوں۔

علی سردار جعفری
حیدرآباد
۲۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء

غیاث شعر و ادب کا بڑا رچا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ اتفاق سے انھیں استاد داغ کے سلسلۂ جانشینی کے آخری تاجدار صفی اورنگ آبادی کا تلمذ نصیب ہوا۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ وہ علم معنی و بیان پر غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ سنگلاخ زمین ہو کہ شگفتہ رواں بحریں ہوں کہ ادق ان کی گرفت میں فرق نہیں آتا۔ ان سے زبان کی یا فن کی کوئی اصولی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ کثرتِ مطالعہ ان کا خاص وصف ہے۔ وہ قدیم اور جدید تمام تحریکوں، روایات اور تجربوں سے باخبر ہیں۔ وہ ہر چمن کے خوشہ چیں ہیں لیکن اپنی انفرادیت سے دستبردار نہیں ہوتے ان کے کلام میں زبان و بیان کی دلآویزی، انداز کا بانکپن بھی ہے اور حقیقتوں کا نیا فرمان بھی۔ وہ غزلوں اور نظموں کے لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ غم ذات کا نوحہ سناتے ہوئے بھی رجائیت ذہنی کو نہیں کھوتے۔ سماجی مسائل کی الجھنوں کا ذکر کرنے سے گھبراتے نہیں۔ وہ نہ صرف آنکھیں کھول کر دنیا دیکھتے ہیں بلکہ مصوّر کی نظر کا رنگ بھی بھرتے ہیں اور شاعرانہ خوش الحانی سے اس کیفیت کو ادا کرسکتے ہیں۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں جوہری کی سی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے موسیقی سے آشنا کان صوتی آہنگ کا لطیف احساس رکھتے ہیں اسی لیے لہجے کی شرافت و شائستگی، آواز کی مٹھاس، تلخ بات کو بھی گوارا بنادیتی ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ

غیاث صدیقی حیدرآباد کے شعرا میں کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں۔ وہ کلاسیکی اسالیب پر جتنی قدرت رکھتے ہیں انھیں جدید طرزِ بیان پر بھی اسی قدر عبور حاصل ہے۔ وہ نظم کہنے کا جیسا سلیقہ رکھتے ہیں، روایت کے احترام کے ساتھ جدید لہجے کو غزل میں سمونے پر بھی ویسے ہی قادر ہیں۔

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے ترجمے پر بھی توجہ کی ہے۔ ترجمے کے میدان میں ان کی کامیابی اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ترجموں پر اصل کا گماں گزرتا ہے۔ وہ شاعر کی روح کے ساتھ اس کے لہجے مخصوص تہذیبی ماحول حتیٰ کہ اس کے نجی علائم کو بھی دیانت اور خلاقیت کے ساتھ ترجمے میں منتقل کرسکتے ہیں۔ انگریزی، عربی اور تلگو زبانوں سے انھوں نے جو ترجمے کیے ہیں، وہ اس کا ثبوت ہیں۔

"قفس رنگ" ان کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کی طبع زاد نظموں، غزلوں کا ایک مجموعہ "آواز کا رنگ" اور "نیلم کے پنکھ" تلگو نظموں کا ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔ "قفس رنگ" اپنی غزلوں انفرادیت کے لحاظ سے خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ غیاث صدیقی کی غزلوں میں جو رنگ و آہنگ ہے، وہ جدید ہوتے ہوئے غزلوں کی کلاسیکیت اور تغزل کا ورثہ دار بھی ہے۔ "آواز کا رنگ" ان کے تخلیقی سفر کا ابتدائیہ تھا تو "قفس رنگ" اردو شاعری، خصوصاً غزل کے امکانات کا روشن اشاریہ ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر
شعبۂ فلسفہ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نیلم کے پنکھ: شیشندر شرما، ترجمہ: غیاث صدیقی

غیاث صدیقی کے تراجم بھی اُردو کی نئی شاعری کا مزاج رکھتے ہیں یقین ہے کہ شیشندر شرما کی شاعری میں وہ تمام عناصر کم و بیش موجود ہوں گے جو جدید ہندوستانی شاعری کی امتیازی صفات ہیں۔ لیکن یہی ترجمے اگر کسی پرانے خیال کے شاعر نے کیے ہوتے تو وہ عناصر دب جاتے یا مسخ ہوجاتے۔ موجودہ صورت میں ان نظموں کا مطالعہ ایک خوشگوار تجربہ ہے۔

میرے ذہن کی وادیوں کو سانس لیتے زمردوں کی مانند سرسبز رہنا ہے (سوغات)

برگِ خشک کی مانند بولیاں اُڑ رہی ہیں (طوفان)

ایک نازک خواب ہنس کی طرح بہنے لگا ہے (تم)

چاندنی کی کرنوں سے بُنا ہوا ہار تاروں کے ہیروں سے بنے ہوئے ہار تیرے منتظر ہیں (شبنم کے موتی)

ان تراجم کو شائع کرکے غیاث صدیقی ہم سب کے شکریئے کے مستحق ہوگئے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

سو سال پہلے.........

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے آبِ حیات میں قریباً سو برس قبل لکھا تھا "ہمارے بزرگوں میں سے دلّی میں اوّل مرزا رفیع سوداؔ پھر شیخ ابراہیم ذوقؔ نے زبان کی پاکیزگی، الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چستی سے کلام میں خوب زور پیدا کیا۔ میر تقی میرؔ اور خواجہ میر دردؔ نے زار حالی، افسردہ دلی، دنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا: غالبؔ نے بعض مواقع پر ان کی عمدہ پیروی کی مگر معنی آفرینی کے عاشق تھے اور زیادہ تر توجہ ان کی فارسی پر رہی، اس لئے اُردو میں غالباً صاف اشعار کی تعداد سو دو سو شعر سے آگے نہ نکلی۔ جراُتؔ نے عاشق و معشوق کے معاملات اور دونوں کے دلی خیالات کو نہایت خوبی اور شوخی سے بیان کیا۔ مومن خاں نے باوجود مشکل پسندی کے پیروی کی۔ لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخؔ اور

خواجہ حیدر علی آتشؔ، رندؔ، صباؔ، وزیرؔ نے شاعری کا حق ادا کیا۔ مگر پھر خیال کرو کہ فقط زبانی طوطا مینا بنانے سے حاصل کیا۔ جو شاعری ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان پورا نہ نکال سکے گویا ایک ٹوٹا قلم ہے جس سے پورا حرف نہ نکل سکے دارالخلافہ دہلی جو کہ انشار، اور اُردو شاعری کے لئے دارالضرب تھا، وہاں ذوقؔ اور غالبؔ نے رسمی شاعری پر خاتمہ کیا۔ لکھنؤ میں آتشؔ و ناسخؔ سے شروع ہو کر رندؔ، وزیرؔ اور صباؔ تک سلسلہ جاری رہا۔ ایک زمانہ میں یہ بات مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خواں۔ لیکن لکھنؤ میں ان دونوں شاخوں کے صاحبِ کمال بھی ایسے ہوئے کہ دونوں کو رونق دے دی۔ اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں، کہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ خاتمہ شعرائے اُردو کا ہیں۔ اور چونکہ اس فن کے صاحبِ کمال کا پیدا ہونا نہایت درجہ کی آسودگی اور زمانہ کی قدردانی اور متعدد سامانوں پر منحصر ہے اور اب زمانہ کا رنگ اس کے خلاف ہے۔ اس لئے ہندوستان کو اس شاعری کی ترقی اور ایسے شعرار کے پیدا ہونے سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے البتہ کوئی نیا فیشن نکلے پھر اس میں خدا جانے کیا کیا کمال ہوں اور کون کون اہلِ کمال ہوں۔

خاتمۂ کلام میں عقل کے نجومی سے سوال ہوا کہ اس شاعری کا ستارہ جو نحوست زوال میں آگیا ہے کبھی اوجِ اقبال پر بھی طلوع کرے گا یا نہیں؟ جواب ملا کہ نہیں۔ پوچھا گیا کہ سبب؟ جواب ملا کہ حکّامِ وقت کی یہ زبان نہیں، نہ ان کے کار آمد ہے۔ اسی لئے وہ اس کے قدردان نہیں، نہ وہ اسے جانتے ہیں نہ اس کے جاننے کو فخر جانتے ہیں۔ وہاں (انگلستان) سے ہمارے شعرار کو جھوٹے خوشامدی کا خطاب ملا ہوا ہے۔ اچھا، یا قسمت یا نصیب۔ جن لوگوں کے کلام ہماری زبان کے لئے سند سمجھے جاتے تھے،

ان کی تو یہ عزت ہوئی ۔ اب اس نیم جان مردہ کے رونے والے چند بڈھے رہے جن کی دردناک آوازیں کبھی کبھی آہِ سرد کے سُروں میں بلند ہو کر سینوں میں رہ جاتی ہیں ۔ کبھی وہ دل آسودہ ہوتے ہیں تو ایک مشاعرہ کر کے مل بیٹھتے ہیں اور آپس ہی میں ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے جی خوش کر لیتے ہیں ۔ شاعر غریب اپنے بزرگوں کی قبریں قائم رکھنے کو اتنی ہی تعریف پر قناعت کر لیں مگر پیٹ کو کیا کریں ۔ یہ دوزخ تو بہت سی تعریف سے بھی نہیں بھرتا ۔

پھر سوال ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر ہے جس سے اس کے دن پھریں اور پھر ہماری نظم کا باغ لہلہاتا نظر آئے ؟ جواب ملا کہ ہاں ہمت و تدبیر کو خدا نے بڑی برکت دی ہے ۔ صورت یہی ہے کہ ایشیا ءمیں ایسے کمالوں کی رونق حکام کی توجہ سے ہوتی ہے شاعروں کو چاہیئے کہ اسے حاکموں کے کارآمد یا ان کی پسند کے قابل بنائیں ۔ ایسا کریں گے تو شعر کہنے والوں کو کچھ فائدہ ہوگا ۔ جس قدر فائدہ ہوگا اسی قدر چرچا زیادہ ہوگا، اسی قدر ذہن و فکر جودت کریں گے اور دلچسپ ایجاد اور خوش نما اختراع کر نکالیں گے اسی کو ترقی کہتے ہیں ۔

یہ تو تم نے دیکھ لیا کہ اُردو میں جو سرمایہ انشا پردازی کا ہے فارسی کی بدولت ہے ۔ قدمائے فارس ہر قسم کے مضامین سے لطف اُٹھاتے تھے ۔ متاخرین فقط غزل میں منحصر ہو گئے ۔ ذی استعداد قصیدے بھی کہتے رہے ۔ اُردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا بہت خوب کیا لیکن وہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے ۔ وہی مقرری باتیں، کہیں ہم لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں کہیں

ادل بدل کرتے ہیں اور کہے جاتے ہیں گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چباتے ہوئے نوالے ہیں انھیں کو چباتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو اس میں کیا مزہ رہا۔ حسن و عشق سبحان اللہ بہت خوب لیکن تا بہ کے؟ حور ہو یا پری گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے اور اب تو وہ بھی سو برس کی بڑھیا ہو گئی۔

ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ان خیالات کے ادا کرنے کے لئے ہمارے بزرگ الفاظ اور معانی اور استعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں اور وہ اس قدر رواں ہو گئے ہیں کہ ہر شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کہہ لیتا ہے۔ اور اگر خیال نظم کرنا چاہے تو ویسا سامان نہیں۔ البتہ ذی استعداد مشّاق چاہیں تو کر بھی سکتے ہیں لیکن کم بخت حُسن و عشق کے مضمون اس کے خط و خال، بہار و گلزار کے الفاظ ان کی زبان و دہان میں رچے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ کہنا چاہیں تو اول اُسے بھلائیں پھر اُس کے مناسب مقام، ویسے ہی نرالے استعارے، نئی تشبیہیں، انوکھی ترکیبیں اور لفظوں کی عمدہ تراشیں پیدا کریں اور بڑی عرق ریزی اور جانکاہی کا کام ہے۔ بے ہمّتی جو ہماری قوم پر حاکم یا اختیار بنی ہوئی ہے اسے اس سے زیادہ روکنے کا موقع کہاں مل سکتا ہے۔

اس اتفاقی معاملہ نے اور تو جو کیا سو کیا بڑی قباحت یہ پیدا کی کہ ارباب زمانہ نے متفق اللفظ کہہ دیا کہ اُردو نظم مضامینِ عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے، اسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے اور کیونکر دھوئے۔ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی، دونوں کناروں سے پانی لائے گی اور اس داغ کو دھوئے گی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی۔"

غزلیں

آنکھ سے چھوٹا کہاں جب ہاتھ سے دیکھا نہ تھا

جتنے سائے تھے اُسی آواز کے پیچھے گئے

پاؤں زخمی ہیں مگر پہلو میں بیساکھی نہیں

گلی گلی میں اُسی رات کا اُجالا ہے

اپنے گھر میں آئے ہیں تو دے کے دستک آئے ہیں

تمہارے حسن کو پلکوں سے بس سراہ سکا

ہنسی لبوں پہ ملی، احتجاج آنکھوں میں
کہ لب کُشا تھا کسی کا مزاج آنکھوں میں

پلک پلک پہ مجھے تھا گمان نشتر کا
کرم کے پردے میں کیا شئے تھی آج آنکھوں میں

دکن میں اپنے یہی درد کے اُجالے ہیں
شکستہ دل میں ہیں مخدومؔ[۱] راجؔ[۲] آنکھوں میں

خزانے غم کے سمندر ہیں ناؤ میں، جیسے
دلوں نے جمع کیا ہے خراج آنکھوں میں

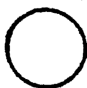
دراز جب ہُوا دستِ سوال ہاتھ کٹا
وہ تشنگی ہے کہ آنسو ہیں آج آنکھوں میں

غیاثؔ تم نے دکن کے صفیؔ[۳] سے کیا سیکھا
کہ پھر رہے ہیں ولیؔ[۴] و سراجؔ[۵] آنکھوں میں

---

۱ مخدوم محی الدین ۲ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ۳ صفی اورنگ آبادی

۴ ولی اورنگ آبادی ۵ سراج اورنگ آبادی



اتفاقاً آ گیا تھا، خود سے وہ آیا نہ تھا
کس طرح اُس کو مناتا میں کہ وہ روٹھا نہ تھا

دل نے وردی پھینک دی اور ہار اپنی مان لی
مصلحت کہتی رہی ایسا نہ تھا، ایسا نہ تھا

پھول دریا پار تھا اور آرزو بے دست و پا
آنکھ سے چھوتا کہاں جب ہاتھ سے دیکھا نہ تھا

اور وہ بھی زہر کھا کر سو گئی تھی سیج پر
کوئی افسانہ یقیناً تھا مگر اِتنا نہ تھا

ایک سایہ سامنے قاتل کے آ کر جھک گیا
قتل ہونے کے لئے آیا تھا وہ پہلا نہ تھا

پھر ہُوا ایسا کہ پُرزے کشتیوں کے اُڑ گئے
لوٹ کر ساحل پہ تنہا، ناخدا سویا نہ تھا

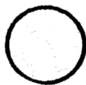
زیست ہونٹوں پر سجائے چھو لیا ناگن کا پھن
موت کو چکھ کر کہا اُس نے مزا کڑوا نہ تھا

جھوٹ جب بھی بولتا تھا خود تڑپ اُٹھتا تھا وہ
دل کی حالت کون جانے دل میں بچھو تھا نہ تھا

صُبح کی باہوں میں جاگا تھا میں کچّی نیند سے
مست آنکھوں میں تری کاجل ابھی پھیلا نہ تھا

جسم کی نیکی سے جنّت ناپتے تھے رات دن
شیخ صاحب کا یہی انداز تو بچکانہ تھا

میں نے اک سایہ سا دیکھا تھا لبِ دریا غیاث
ساتھ اس کے ہو گیا اور نام تک پوچھا نہ تھا



گیسوؤں میں نکہتوں کے قافلے لوٹے گئے
ہونٹ تک شعلے گئے رُخسار تک شعلے گئے

صرف اُس کے قہقہے ہیں منجمد اِس جھیل میں
سچ بتا اے ماہ، کتنے قافلے آئے گئے

چاند نکلا اور ہم دونوں بہاروں سے ملے
رات کے مُنہ سے نوالے ہجر کے چھینے گئے

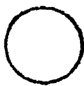
ریت پیاسی تھی، شعاعوں کی دُعا کرنے لگی
اُڑ گئے دریا، صدف بھی دھوپ میں سینکے گئے

ذہن میں پرچھائیاں ہیں، دل میں کچھ جملوں کی گونج
کس کو آنکھوں سے لگاؤں سارے خط وہ لے گئے

ایک نغمہ لوٹ جاتا ہے اُفق کے شہر میں
جتنے سائے تھے اُسی آواز کے پیچھے گئے

سُرخیاں پڑھ کر تجھے پہچاننے والے یہاں
کچھ تو سُولی پر چڑھے کچھ آگ میں پھینکے گئے

باغباں نے رنگ و بُو سے اپنا دامن بھر لیا
ہم غیاثؔ اب رہ گئے ہیں، وہ جو تھے اچھے، گئے



عجیب بات ہے یارب درخت سوکھا ہے
ہر ایک شاخ پہ بیٹھا ہُوا پرندا ہے

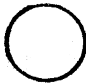
ہے آرزو کہ مری فکر کی دھنک میں بسو
تمہارا قُرب تو روندی ہوئی تمنّا ہے

نہ رنگ جینے کا کوئی، نہ سوچنے کے خطوط
وہ شخص کیا ہے، دُھندلکا دکھائی دیتا ہے

میں کب سے یاد نہ آیا تجھے، بتا سچ سچ
حِنا کا رنگ ہتھیلی میں کب سے پھیکا ہے

سُنا تم آئے تھے جس رات میری نگری میں
گلی گلی میں اُسی رات کا اُجالا ہے

شعورِ غم کو بھی مہمیز مانتا ہوں مگر
ملا تو غم بھی اپاہج ملا، تماشا ہے



دن میں مرنا جُرم ہے تو شب بھی زہریلی نہیں
کس توقّع پر جئیں اب زُلف بھی ڈستی نہیں

اُس نے چاہا تھا کہانی لکھ کے ہو جائے اَمر
خود کہانی ہو گیا، تحریر تک سُوکھی نہیں

باہنیں منزل کی کُھلی ہیں، مرحبا کا شور ہے
پاؤں زخمی ہیں مگر پہلو میں بیساکھی نہیں

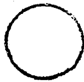
موم کے دو ڈھیر ہیں اِس کانچ کے فانوس میں
دو دلوں کی داستاں ہے تم نے پہچانی نہیں

پیاسی بے زینہ چٹانیں اور تپتی ریت ہے
آبلہ پا کے لئے دریا نہیں، کشتی نہیں

وہ کفِ دریا نہیں پہنچا ابھی دہلیز تک
بِھینی بِھینی کڑوی خُوشبو صحن میں پھیلی نہیں

انکساری نے فرازِ فن کی رکھ لی آبرُو
زیست کو سب کچھ دیا، غربت مگر بیچی نہیں

کِس کا خنجر، کِس کا سینہ، سائے تک مبہم غیاثؔ
یہ روایت آنکھ والوں نے کبھی لکھی نہیں



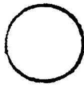
کتنے ایسے لوگ ہیں جو آئینہ کہلائے ہیں
آئینے میں اپنی صورت دیکھ کے شرمائے ہیں

خودشناسی کو چلی کر سرخ رو وہ ہو گیا
ہم تو اپنے آپ سے مل کر بہت پچھتائے ہیں

ہو کے دنیا میں سبک اترے ہم اپنے جسم میں
اپنے گھر میں آئے ہیں تو دے کے دستک آئے ہیں

برف پگھلی اُس کے ساغر میں تو آنکھیں نم ہوئیں
سارے قصے بے ثباتی کے اسے یاد آئے ہیں

سطحِ دریا پر تو آنکھیں پھوٹتی تھیں، دوستو
ڈوب کر ساحل پہ نکلے ہیں تو موتی لائے ہیں



تمام عمر حریفوں سے بس نباہ سکا
مرے حبیب، تجھے ٹوٹ کر نہ چاہ سکا

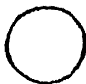
پناہِ قرب کی خوشبو میں منجمد تھے لفظ
تمہارے حسن کو پلکوں سے بس سراہ سکا

یہ کیسا خواب تھا شہ رگ نے آگ اُگلی تھی
بس اتنا یاد ہے مقتل میں، میں کراہ سکا

نہ مل سکی تجھے دھرتی پہ لکشمی اے دِل
سرسوتی سے خلاؤں میں تو نِباہ سکا

نہیں تھا واقفِ گلبانگ، عیشِ گل چینی
حنائی ہاتھ میں چیخا، نہ گل کراہ سکا

غیاث، میں بھی تضادوں کا شہر ہوں، دیکھو
میں اپنے آپ سے کس کس طرح نِباہ سکا



جزیروں میں بسنا، سرابوں کو پینا
یہ کیسا زمانہ، نہ مرنا نہ جینا

روایت بھی سُن لی، ترقی بھی دیکھی،
وہ سینہ بہ سینہ، یہ زینہ بہ زینہ

یہ سب ہم سمجھتے ہیں، تم لب نہ کھولو
کٹیں شہ رگیں برگِ گُل سے، یہی نا

نظمیں

حسینی آنکھیں ... ہزاروں ہونٹ اک دستِ مبارک پر جھکے تھے

انجیر کا پتّا .... نگاہوں پر، لبوں پر اور سوچوں پر بھی پابندی نہیں تھی

صدائے جلوۂ برقِ فنا .. آوازوں کی دھنک بچھی تھی

یا کبیج .... میرے فن کی لاش کہاں پہچانیں گے

گیندیں .... سونا، چاندی، تانبا، پیتل، لکڑی، کاٹن، ریشم کی

لکیر مت پیٹو ... کلی کی چیخیں، گلوں کی سانسیں، صریرِ خامہ میں قید کر کے

قناعت ؟ .... میں اپنی اس عظمت پر کتنا قانع ہوں

احساسِ کمتری .... کمزوروں کے ہاتھوں کو اور ہاتھوں کو تکتا رہتا ہے

حُسینی آنکھیں

گواہی دو کی بس تھی
لیکن اتنے خط
ہزاروں لب
ہزاروں دستخط
جہادِ یَد
جہادِ نُطق و دل پر غالب آیا
لہو کی پیش کش کی
سَرفروشوں نے، گواہوں نے

حسینی شاہدوں نے
"جسے نانِ جویں بخشی تھی رب نے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی مِلا تھا"

ہزاروں ہونٹ
اک دستِ مبارک پر جُھکے تھے
مدینے سے نقوشِ پا زمینِ کربلا تک
خون میں ڈوبے ہوئے آئینے، جیسے

ہزاروں تیر چھوٹے
زمیں کے ہونٹ پھیلے
بہتّر شہ رگوں نے آگ اُگلی
سَوا نیزے پہ تھا مہرِ رسالت
فضا چُپ تھی
خموشی
بے کراں اندھی خموشی

یہ کیسا قتل تھا
قاتل بھی دل میں کٹتے جاتے تھے
خموشی کے یہ سائے
نطق بن کر
یا پرِ پرواز بن کر
شام کے دربار تک پہنچے
زباں چُپ تھی
مگر آنکھیں
کہانی، عظمتِ سبطِ رسالتؐ کی سُناتی تھیں

آنکھیں کس کی تھیں، رسالت کی نشانی آنکھیں
خون اُتر جائے تو بس لعلِ یمانی آنکھیں
آبِ شمشیر کہ دریا کی رَوانی آنکھیں
تُنک آبی سے کہاں مانگتیں پانی آنکھیں
ہونٹ پیاسے تھے اِدھر اور تھیں پیاسی آنکھیں
اُس طرف خون کی پیاسی تھیں سیاسی آنکھیں

آبِ نمکین میں گھلتی تھیں ہزاروں آنکھیں
خونِ ابیض میں بھی دُھلتی تھیں ہزاروں آنکھیں
دل کی میزان پہ تُلتی تھیں ہزاروں آنکھیں
ہر خطِ جسم پہ کُھلتی تھیں ہزاروں آنکھیں
آنکھیں تحریر بھی، تقریر بھی، تصویر بھی تھیں
آنکھیں سرکارؐ کے اک خواب کی تعبیر بھی تھیں

۳۰

انجیر کا پتّا

کِسے ہے ہوش "کُن" کا
صرف اتنا جانتے ہیں ہم
بدن ننگے تھے
جب انجیر کے پتّوں کے نیچے
نُکیلے تیز پتّھر ہاتھ میں تھے
نرم پتّھر کٹتے جاتے تھے
چھناکوں کا تسلسل
سُروں کے پھول

کانوں میں مہکتے تھے

نگاہوں پر، لبوں پر اور سوچوں پر بھی
پابندی نہیں تھی
خوشی سچّی خوشی تھی
غم برابر اشک بنتا تھا
تصنّع کے قدم
ذہنوں، دلوں کی عنبریں دہلیز تک
پہنچے نہ تھے
ابلیس نے
تقسیم پر
آدم کو اُکسایا نہ تھا

صَدا ہے جلوۂ برقِ فنا

سپنے میں اک نغمہ دیکھا
آوازوں کی دھنک بچھی تھی
جھیلوں کے اطراف چنار
بَرف کے تودے
اور
شگافوں میں لہراتے ناگوں کے پھن
ہونٹوں کو ڈس لیں
تو لاکھوں نغمے پھُوٹیں
کانوں کو چھُولیں
تو سُننے کی شکتی مل جائے

میں نے سارے ناگوں کے گچھّوں کو اُٹھا کر
اپنے بدن پر ڈال لیا
سارا زہر نکال لیا
اَب تو میں
ہر نغمے کو
اپنے ہر بُنِ مُو سے سُن سکتا ہوں
چُھو سکتا ہوں
چکھ سکتا ہوں
پلکوں میں چُھپا کر رکھ سکتا ہوں

پاکیج

(لفظ کی فریاد)

دُکھ سُکھ، فاقے، بدمستی
دریا، صحرا، چیونٹی، ہاتھی
نابینائی، رازِ بصیرت
خوف و نفرت، زادِ سفر

میری کہانی پڑھنے والے
میرے شکستہ اعضاء کو کیوں جوڑیں گے
میرے فن کی لاش
کہاں پہچانیں گے

شکلیں کیسی بگڑی ہیں
ہاتھ نہیں یا پاؤں نہیں
یا آنکھ نہیں

کیا لفظ بھی انساں جیسے ہیں
کیا قبروں اور کتابوں میں
کچھ فرق نہیں ؟

گیندیں

گیندیں روز اُچھلتی ہیں
کرکٹ کے میداں سے لے کر
گھر کے ٹیبل ٹینس تک
گیندیں گویا
ڈوبتے سُورج کی تھالی
چاند کی ساسر
سونا، چاندی، تانبا، پیتل
لکڑی، کاٹن، ریشم کی
دست بدست
بلند و پست
اِن کی قیمت ـ ـ ـ ـ

ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

دو آنے سے تاج محل تک

لکیر مت پیٹو

کُنوَیں کے مینڈک
کُنوَیں کے اندر
فَضا کی سانسوں سے لے کے تیشے
اَدھورے پیکر تراشتے ہیں
روایتوں میں اسیر ہیں یہ
نظر میں اِن کی
تِندی کی وادی میں سیرِ چشمِ گرسنگی ہی
سُخَن کی جاں ہے

سُنا ہے مغرب میں جب ہو برسات بے محابا
تو اندھی تقلید کے یہ رسیا

دیارِ مشرق میں چھتریاں اپنی کھولتے ہیں

غرور اِس کا ہے اُن کو ہر دم

کٹی ہوئی انگلیوں سے اپنی

قلم پکڑ کر

شبیہِ جذبات و شوقِ پنہاں

بیاضِ دل پر اُتارتے ہیں

غرور اِس کا ہے اُن کو ہر دم

اُفق کے جھولوں میں

نیم پہروں کو بند کر کے

کلی کی چیخیں، گُلوں کی سانسیں

صریرِ خامہ میں قید کر کے

سُنا سکے ہیں

قلم سے عالم کو قتل کرنا ہے اُن کا مسلک

قلم کی نِب، روشنائی ساری

کسی دُکاں سے نظر بچا کر

اُڑا کے لائے ہیں تیرگی میں

سخن کے یہ ناخدا جب اُردو میں بولتے ہیں

مرضِ نسق کو سکونِ اَوسط میں تولتے ہیں

پڑھیں نہ لکھیں
مگر تخلّص لُغَت پہ بھاری
حَسَد کے کج فہمیوں کے ایندھن
تنّور احساسِ کمتری کے
نظر پہ مُہریں، لبوں پہ مہریں، دلوں پہ مہریں
یہ تیر و شمشیر
میوزیم کے حسین شوکیس میں بھلے ہیں
یہاں تو ایٹم کی بات کیجے
بڑے تکبّر سے تمکنت سے
اُٹھا کے گردن
حُروفِ اَبجد کا وِرد کر کے
سمجھتے ہیں فلسفہ سُنایا

غیاثؔ میری یہ آرزو ہے
وہ میرے ادراک کے سہارے
کنُوّیں سے باہر نکل کے دیکھیں

سُخن کی دُنیا میں وُسعتوں کو
سُخن کی آنکھوں میں حَیرتوں کو

قناعت ؟

اخباروں میں سب سے پہلے
مُشاعروں میں سب کے بعد
میرا نام
اکثر آتا ہے
میں اپنی اِس عظمت پر
کتنا نازاں ہوں !

کتنے مُغنّی، کتنے مِراثی
میری غزلیں گاتے ہیں
میں اپنی اِس رفعت پر
کتنا قانع ہوں !!

احساسِ کمتری

شاید اپنی چھوٹی سی کمزوری سے
وہ واقف ہے
آئینہ در آئینہ
ربِّ سخی نے
اس کو دونوں ہاتھ دیئے ہیں
لیکن وہ تو
کِسی سمے بھی
کسی بَشر کو
کرتا نہیں سلام، نمستے
کمزوروں کے
ہاتھوں کو اور ماتھوں کو
تکتا رہتا ہے

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری
اور
ڈاکٹر وحید اختر کے نام

غزلیں

وہ قتل ہو کے بھی فصلیں نئی اگاتا ہے
لہو کی جھیل میں صدیوں کے بیج ڈال گیا

(غیاث صدیقی)



سُنا، میں ہوں پیدائشی بدشگون
نہ آنکھوں کی ٹھنڈک، نہ دل کا سکون

مُصوّر سے پوچھا ہے تصویر نے
تری اُنگلیوں سے ٹپکتا ہے خون

ارادہ عمل کا نیا نام تھا
ازل کی جبیں پر ملے "کاف نون"

یہ پتّھر ترے گھر کی بُنیاد ہیں
ترے کام آئے گا میرا جُنون

سمندر پہ بہتا ہوا ایک جھوٹ
سُنا، بن گیا ساحلوں کا سکون

پسینوں کے جاذب کرنسی کے نوٹ
اُڑیں کالے گھوڑے چلے مانسون

سفارش کی رِکیلیں ٹھنّسے دماغ
حقارت کے سر تھے ہمارے قُرون

سُنے اُس کی جرأت کے قصّے بہت
تو خنجر پہ نکلا کبوتر کا خون

مجھے برف کی وادیوں میں مِلا
ملائم، گلابی سا، کشمیری اُون

صنوبر کے سائے میں خوش ہے غیاث
ترستے ہیں چھت کو ہوَس کے سُتون



تقاطر سے پلکوں کے، جی ہے نڈھال
اُڑا قہقہہ، اک دھنک پھر اُچھال

پر و بال یا رب، جوابوں کے دے
مجھے گھیر لیں گے، سوالوں کے جال

دبے پاؤں آ کر نہ جا، اے بہار
اک آئینہ رکھ، رو بروئے غزال

دکھا دوستی کے بھی جوہر دکھا
نکال آستیں سے تو خنجر نکال

بڑے ناز سے دل نے پیدا کیا
ہوا قتل آ کر لبوں پر سوال

کہاں ملتے ساحل پہ ٹکڑے ترے
تو دریا میں ڈوبا بچا بال بال



وہ آیا، کھل کے ملا، دل کا سب ملال گیا
وہ بُت تراش مجھے صورتوں میں ڈھال گیا

وہ قتل ہو کے بھی فصلیں نئی اُگاتا ہے
لہو کی جھیل میں صدیوں کے بیج ڈال گیا

میں بہہ چلا تھا اَنا کے حسین دھارے میں
دکھا کے آئینہ کوئی مجھے سنبھال گیا

میں یاد آیا تو بے دست و پا ہُوا وہ بھی
مصیبت آئی تو اکثر وہ ہنس کے ٹال گیا

یہ مسئلہ کہ حقیقت جواب سے کم تھی
تمہارے سامنے کیوں صورتِ سوال گیا

کوئی ندیدہ سخنور غزل کے کوچے میں
بزورِ علم در آیا تھا، پائمال گیا

وہ گہرا پانی تھا، غوّاص کی پرکھ تھی اُسے
جتن ہزار کیے، سطح پر اُچھال گیا

خود اپنے گھر میں خود اپنا گِلہ ہیں کیا کرتا
ہزار بار وہ آیا، مگر میں ٹال گیا

ہیں آس پاس کی تاریکیوں میں گُم تھا غیاث
دمک دمک کے کوئی شعلۂ جمال گیا



ہر طرف شور اُٹھا، آگ لگی، آگ لگی
اشک سمجھے تھے جسے ہم، وہ شرارا نکلا

عکس دریا میں ترا دیکھ کے مَیں غرق ہُوا
دشمنِ جاں تو مری جان سے پیارا نکلا

نہ ملا وہ، جسے احساس کی منزل کہئے
یوں تو ہر موج میں پوشیدہ کنارا نکلا

پلکیں بھیگیں جو تری، میں بھی ندامت سے بچا
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا نکلا

آ گئے راہ پہ سب رات کے بھوُلے بھٹکے
آپ کے ماتھے پہ جب صبح کا تارا نکلا

یہی تہذیب و روایت ہے وطن میں اپنے
غیر کے ہاتھ کٹے، خون ہمارا نکلا



کوئی گُل دل کے آس پاس رہے
رنگ اُڑے، پیرہن میں باس رہے

چلیئے دریا کی دُوسری جانب
اک کنارا اگر اُداس رہے

لفظ مت پھینکیئے، چلایئے تیر
آرزو وہ، جو بے لباس رہے

ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر سیّدہ جعفر، جیلانی بانو

کرشن چندر اور اقبال متین کے نام

درونِ خانہ

...لوری

...بھیگا آٹا

...اور وہ نغموں پر مرتی تھی

سوئی اور گلاب

تھکن

انمول انگوٹھی

چار نشستیں

بوڑھا رامیّا

لوری

سو جا مُنّے، سو جا
کل سے اپنے گھر میں
کتنے فاقوں کی مہمانی ہے
عبّو، سلّو
ہمسایوں سے مانگی پینچ
پیئے سوئے ہیں

تیرے ابّا کب سے
پھولوں کی چادر کے نیچے
مٹی کے بے نور مکاں میں
سب سے رُوٹھ کے

سڑتے گلتے جسم کو پہنے
سوئے ہوئے ہیں

دُودھ کہاں سے لاؤں مُنّے
میں نِربل ہوں، تو کومل ہے
کون ہمارا والی
عمرؓ نہیں
گاندھی بھی نہیں ہے
دروازوں پر
دونوں کی دستک بھی نہیں ہے

...... اور ... وہ نغموں پر مرتی تھی

اُوشا جب دفتر کو جانے گھر سے نکلتی
روز اُسے بس میں اک اندھا
سجا سجایا ملتا
نیلا سوٹ، کالی عینک، نارنجی ٹائی
کوٹھی سے پالی ٹکنک تک
چُپ چُپ سا وہ رہتا
بس جب تھوڑی آگے جاتی
بیگ سے اپنے، بانسری لے کر
نغموں کے پیالے چھلکاتا
کنڈکٹر بھی، پاسنجر بھی، ڈرائیور بھی
سب اُس کے نغموں میں جیسے کھو جاتے
راہ میں اک ویران جگہ پر بس رُکتی

وہ اندھا چُپ چُپ اُتر کر چل دیتا
روز کا یہ معمول تھا گویا
روز ہی اُوشا سوچتی اُس کے بارے میں
اُوشا کے پیچھے بیٹھی اک لڑکی نے
اُوشا سے پوچھا
"اندھے کے بارے میں تم کیا جانتی ہو"
پھر خود ہی بھیگی آنکھوں سے وہ چھلک پڑی
"یہ اندھا میرا بھیّا ہے
اُس کی محبوبہ
بس میں جل کر راکھ ہوئی تھی
دیا سلائی نے ساری کے آنچل کو چوما
دونوں آگ میں ڈوب گئے
ہاسپٹل سے دونوں نکلے
یہ اندھا تھا، وہ مردہ تھی
یہ نغموں کا خالق تھا
اور وہ نغموں پر مرتی تھی

بھیگا آٹا

چندریکا کی شادی کو دو ماہ ہوئے تھے
چندریکا جاگ اُٹھی سویرے
بلاؤز کے ہُکس لگائے

بالوں کو سمیٹا، جوڑا بنایا
ساری کو کچھ درست کیا
چپّل پہنی، انگڑائی لی
بِڈ پر سوئے اپنے پتی کو
مُسکا مُسکا کر دیکھا

پھر ہاتھ مُنہ دھوکر کنگھی کی
اَیپرن پہنا

کچن کا دروازہ کھولا

آٹا بھگویا

آٹا گوندتے وقت اُسے کچھ یاد آیا

وہ ہنسنے لگی

پھر زور زور سے ہنسنے لگی

پھر اُس کے پتی کی آنکھ کھُلی

وہ دوڑا دوڑا آیا

چندریکا کو کچن میں ہنستے دیکھا

چندریکا نے اس کو اپنے پاس بلایا

بھیگے آٹے میں لُت پُت اپنے ہاتھ دکھائے

لپک کے بولی "چولھا سلگا دو"

سَوَنی ـــــــ اور گلاب

ویسے سُجاتا گھر سے نکل کر
کالج جاتی
راہ میں سَوَنی پھولوں کی دوکان سجائے
بیٹھا رہتا
رِکشا رُکتی ایک منٹ کو
"ایک گلاب؟"
"چار آنے" لے لو
جوڑے میں رونق آجاتی
پَونّیوں کے ڈھیر لگے
پھولوں کے کتنے ہار بنے
بارہ مہینے، بارہ یُگ بن کر گزرے
اور سُجاتا، بی، اے نے
ماتا پِتا کے آگے اپنا ماتھا ٹِکا یا

مہندی کی گُل کاری دیکھی
ہتھیلیوں نے، تلووں نے
شہنائی ابھی بجنے بھی نہ پائی
دُلہا والے نقدی کم ملنے پر
تھوڑا رُوٹھ گئے

پھر بات بڑھی
پھر لَوٹ گئی بارات
اور سُجاتا کے آنسو
بی، اے کی ڈگری کو دھوکر بہنے لگے
اتنے میں لوگوں نے دیکھا
سُونی کے دو ہاتھ بڑھے
موٹا تازہ ہار گلابوں کا لہرایا
اور سُجاتا کی گردن میں
جُھول گیا
اور سُجاتا کے چرنوں میں
ڈھیر پڑے تھے جُوتیوں کے

تھکن

گیارہ بجے وہ دفتر کو پہنچی تھی
مَیلے کپڑے، پانی، جلتی دھوپ
وہ گھر میں چھوڑ آئی تھی

سوچ رہی تھی
کاش، وہ مَن بھر دھوپ
مُقفّل کمرے میں لٹکا کر آتی

پانچ بجے جب گھر لوٹے گی
پانی دھوپ کہاں کھوجے گی
صرف تھکن رہ جائے گی

انمول انگوٹھی

ریحانہ کا چاچا آیا
ارضِ عرب سے اتنی ساری چیزیں لایا
ٹیپ رکارڈر، دستی گھڑیاں
پاتابے، لائٹر، فاؤنٹن پن
ڈھیروں کپڑے
سامن، ساڈن، ہیرنگ، ٹافی
چیز، ہنی، کھجور کے ڈبے
میٹھی خوشبو والے سینٹ
کتنے قصّے لایا
اُس کے گھر میں
بکری، بندر، مرغی، کبوتر

ٹھنڈے کمرے، لمبی موٹر

ان کے علاوہ

اَنْتَ ، اَنْتُمْ بولتے بچّے

صبح، گجر دم، ننھّے ننھّے ہاتھ دُعا کو اُٹھتے ہوں گے

قرآں، لحنؔ سے، سنتے سُناتے ہوں گے

جیسے شہد ملائی کھائیں

ویسے اُن کی آپس کی ساری باتیں بھی

"قَالَ، قَالُوْا" آیت جیسی لگتی ہوں گی

ریحانہ کے ابّا، امّی

ریحانہ کے چاچا کو دل میں رکھتے تھے

چاچا نے چاچی کو

چھوٹے موٹے خط بھی لکھے، تار بھی بھیجے

ریحانہ نے اک دن دیکھا

"چاچا، ابّا گلے ملے تھے

چاچا، ابّا، امّی

کُھس پُھس باتیں کرتے رہے تھے

دوسرے دن

پھوپی، پھوپا، دادی، نانی

خالہ خالو آئے

امّی ابّا نے سب کی دعوت کی

چاچا نے سب سے ہاتھ ملایا

میوے، مٹھائی، گھر گھر میں تقسیم کئے

سارا گھر کا گھر، خوش خوش تھا

سونے کی انمول انگوٹھی

میری اُنگلی میں پہنا دی

میں خوش بھی تھی، حیراں بھی تھی

پھر بابا نے مجھ کو پکارا "تَعالْ یَابِنْتْ"

سب ہنسنے لگے، پھر میں بھی ہنسی

پھر مجھ سے بڑی آپی نے کہا

تو بہو بنی ہے چاچا کی

میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں پہنچی

سب سے پہلے آئینے میں اپنی صورت دیکھی

پھر صوفے پر بیٹھ گئی
سوچ رہی تھی
چاچا کا بیٹا کیسا ہوگا
ویسے فوٹو میں نے دیکھا تھا
وہ عَرَبی فَٹ فَٹ بولے گا
میں فُٹ فَٹ انگریزی بولوں
جب تک وہ قرآن پڑھے گا
میں انڈے تل ڈالوں گی
توس بھی سینک رکھوں گی
مکھّن کے لیپ لگا دوں گی
اُس کے میز پر آنے تک
میں ٹی وی دیکھوں گی
پھر میں نے یہ بھی سوچا
چاچا کا بیٹا خوب کماتا ہوگا
چاچا سے اجازت لے کر
اپنے بھاگ متی کے پیارے وطن میں

اپنے لوگوں کو تحفے بھیجوں گی
ان کو اپنے دوجے وطن بلواؤں گی
پھر اپنے ٹھنڈے کمرے میں
سب کو ٹی وی دکھاؤں گی

پھر میں نے یہ بھی سوچا
چاچا کا بیٹا کار تو تیز چلاتا ہوگا
میں ڈرتی بھی ہوں
خوش بھی ہوتی ہوں

ابّا تو دھیرے دھیرے کار چلاتے ہیں
اور میرا دَم گھُٹتا ہے"

چار نشستیں

ہم سب کل پکچر کو گئے تھے
پہلی سیٹ پہ وہ تھی
دوسری سیٹ پہ میں تھا
تیسری سیٹ پہ میری ریحانہ بیٹھی تھی
چوتھی سیٹ پہ وہ تھا

تاریکی ماحول پہ چھائی
پکچر میں ہیروئن اِٹھلائی
بائیں جانب سے اک پیکٹ کا جوکا لہرایا

اک ہاتھ بڑھا
انگارہ،
جیسے میری ہتھیلی میں اُگ آیا
کتنی حسیں ہیروئن تھی وہ
آج سے پہلے بھی تو یہی پکچر دیکھی تھی
لیکن آج کی بات الگ تھی

میں نے دائیں جانب دیکھا
اُس نے کیڈبری کا پیکٹ
ریحانہ کی سمت بڑھایا
ریحانہ نے پیکٹ لے کر
میرے دائیں ہاتھ پہ رکھا
برف کا ٹکڑا
میری ہتھیلی میں اُگ آیا
ہیروئن کا چہرہ
مجھے بھدا سا لگا

سفید پلکیں

بوڑھا رامیا

جب بچّہ تھا، آنگن میں کھیلا کرتا تھا

پتّھر مار کے املی، کیری گراتا تھا

خود کھاتا تھا

پڑوسیوں کے بچّوں کو بھی دیتا تھا

اس نے دیکھا، اَن داتا کی شادی ہوئی تھی

سارے گاؤں کو کھانا ملا تھا

ساری، چولی، کُرتے، دھوتی

گھر گھر میں تقسیم ہوئے تھے

اَن داتا نے رانی دُلھن کو

جگ مگ جگ مگ ہیروں کا ہار اپنے ہاتھوں سے پہنایا

رامیّا نے دروازے کی آڑ سے سب کچھ دیکھا تھا

اَن داتا نے رانی کو سینے سے لگایا

اور ـــــــــ کسی نے رامیّا کا کان پکڑ کر

اس کو وہاں سے پھینک دیا تھا

اَن داتا اور رانی دُلھن

سرد محل کے حوض میں پیراکی کرتے

باغ میں رائیڈنگ بھی ہوتی تھی

اک دن رامیّا نے دیکھا

اَن داتا نے رانی دُلھن کو

چمڑے کے چابک سے اتنا مارا اتنا پیٹا

وہ گر کر بے ہوش ہوئی تھیں

پھر رانی کے مَیکے سے کچھ لوگ بھی آئے

میکے سے وہ پھر نہیں لَوٹیں

رامیّا نے پھر دیکھا

اَن داتا نے دوجی شادی کی

پھر ہیروں کا ہار گلے کا پھندا بنا

رامیّا کی موچھوں میں بھی

تھوڑی سفیدی آنے لگی تھی

اَن داتا کے محل میں

کتنی رانیاں آئیں کتنی گئیں کچھ یاد نہ تھا

رامیّا نے اک دن دیکھا

اَن داتا کی چِتا پہ رونے والی آنکھیں سہمی ہوئی تھیں

جیسے اگر آنسو نہ بہیں تو چمڑے کا چابک برسے گا

سرکاری وردی پہنے لوگوں نے آکر

سارے محل میں قفل لگائے

سارے چمن ویران ہوئے

سارے نوکر بھاگ گئے

رامیّا بھی محل کے پیچھے اک کُٹیا میں رہنے لگا

اَن داتا کا چھوٹا لڑکا مکتب کو پیدل جاتا تھا

اَن داتا کی آخری چھوٹی رانی

اب تو بوڑھی لگتی تھی

لڑکا چھوٹے مکتب سے کالج کو گیا

ماں بیٹے پیلس کے اک گوشے میں
چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے
لڑکے نے کالج سے ڈگری لی
کالا کوٹ پہن کے وہ تو روز عدالت جانے لگا
پھر رامیّا نے دیکھا
سارے محل کے قفل کھلے
پیلس میں آنکھوں کا
سرکاری دواخانہ آیا
محل کے گوشے میں بھی بہاریں آنے لگیں
نرگس کا اک تختہ تھا
بیچ میں اَن داتا کا لڑکا، اس کی پتنی
سبزے پر لیٹے تھے
رامیا آنکھوں میں دوا ڈلوا کے وہاں سے لوٹ رہا تھا
رامیا کی بوڑھی پلکوں نے دیکھا
چمڑے کا چابک سڑ گل کر کونے میں پڑا تھا
اس چابک پر پھول چنبیلی کے منڈوے سے گرتے تھے

پیچھے اک دالان نیا تعمیر ہوا تھا

دیواروں پر دُلہا دُلھن کی اگاندھی جی کی

تصویریں آویزاں تھیں

سب سے اُوپر منبسی والے کا فوٹو تھا

رامتیا نے سر کو جُھکایا

اور خوشی کے دو آنسو

بوڑھی پلکوں سے ٹپکے

دکن کا پکاسو

(سعید بن محمد نقش)

نقطے، نقطے، نقطے
کتنی لکیریں، کتنے دائرے، کتنے مثلث
کتنے رنگ

سیہ قلم سے ٹپک پڑی ہے
قوسِ قزح
شعر کا فن، نغمے کا بدن
یا خوشبو کا پیراہن
لُولُو، مرجاں
ہیرے، نیلم
بولتے جسم
سب کچھ چار لکیروں میں
مغرب کی جانب مت دیکھو
مشرق سے سورج نکلا ہے

پروفیسر حبیب الرحمٰن اور پروفیسر ہارون خاں شیروانیؔ کی نذر

ترجمے

یروشلم کے نغمے

(عراقی شاعر کی عربی نظم کا ترجمہ)

(پہلا گیت)

یروشلم میرے بغداد کے گھر کا ایک چمن ہے
یروشلم ایک کھُلی کتاب ہے
جو خوابوں میں بھی پڑھی جاتی ہے
یروشلم میرا شہر ہے
آزاد نظم ہے
امن کا نام ہے
ایک جنگ ہے
جو مستقبل کی تعمیر کے لئے لڑی گئی ہے
یروشلم ایک پُل صراط ہے
جو خدا سے مجھ تک پہنچتا ہے
یروشلم میں ہوں

(دُوسرا گیت)

ایک شاہیں طوفانوں کی وادیوں میں

گہری نیند سوتا ہے

اس کا بدن

تیز ہواؤں کی مانند، سُبک

اور دشمنوں پر جھپٹنے والا ہے

میں طوفانوں کی وادیوں میں

گھومتا پھرتا ہوں

جنگ کی لغت میں اس کو تلاش کرتا ہوں

اُس کو ـــــ جو آج یہاں نہیں ہے

وہ آتا ہے

اور طوفانوں کا جامِ صحّت

ہونٹوں سے لگاتا ہے

میں نظمیں لکھتا ہوں اس سرزمین کے لئے

جن کو طوفان بہالے گئے

ہوائی قلعوں کے میں خواب اکٹھے کرتا ہوں
کیا یہ شاہین اک صنفِ نازک ہے
جو طوفانوں کی ساتھی ہے
جو طوفانوں کے بچّوں سے باتیں کرتی ہے

اے نازنین
میں تمہاری ان مسرّتوں کو تسلیم کرتا ہوں
جن کے بل تم سر بلند ہوئی ہو
کیا تم میرے غموں سے واقف ہو
جو میری اُفتاد کا باعث بنے
شجر گاتے ہیں
سمندروں کے بالک
چاندنی کی اُور غوطے لگاتے ہیں
آؤ، تاریخ کے اجنبی سے پوچھو
کس قوّت کی جیت ہے
خیالات کے سائرن بجنے لگتے ہیں
اور شاعر لفظوں کے شفا خانے میں داخل ہوتا ہے

بربریت جنگ کرنے کو نکلتی ہے
اور اسرائیل اس دہلیز پر مر جاتا ہے
اسرائیل ٹکڑے کیا ہوا ایک گھوڑا ہے
جو انقلاب کی رات میں
آنکھوں کو بند کر لیتا ہے
دروازے جو امن کی دلدل کی طرف کھلتے ہیں
ایک خنجر میرے دل میں ڈوبتا ہے
اور نشانہ چوکتا ہے
اے میرے لوگو، اے میرے ساتھیو
وقت میری طرف آرہا ہے
بند شہروں سے
چہروں پر موت کی نقابیں
پیار کے لئے کھاد
خوشی کے لئے شجر
موجیں کون سا گیت کناروں کو سنا سکتی ہیں
گندک کے پتّھر

دُنیا کی ریت پر آہیں بکھرتے ہیں
لباسِ شب میں جنگل خوبصورت ہے
موجوں کے چہرے پر
وہ ہنستا ہے
افسوس میں دیکھتا ہوں
یہ امن نہیں ہے
یہ دارالسلطنت ہے
سنہرے بالوں کا بچّہ ہے
جو رو رہا ہے اور لفظوں کو تقسیم کر رہا ہے
میرے اجداد کا دم گھونٹنے والی خاموشی
اپنے بزرگوں کی ہنسی میں پاتا ہوں
کیا میں اس سمندر کو گرفت میں لینے کی جرارت کر سکتا ہوں
اور لہروں کے ماضی میں سفر کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں
رات کی رات میں
میرے بدن سے ایک سُورج پھُوٹتا ہے
گھنٹیوں کی آواز اور سمندروں کا شباب میرے ساتھ ہے

ہر رُک کے اُڑتے ہوئے بادبانوں میں

میں اپنی آواز کو سُن رہا ہوں

طوفان، جیسے جنگل میں کسی راکشس کی آنکھیں

میں خواب میں جنگل اور سمندر دیکھ رہا ہوں

اے میرے عہد کے کنارے

اے طوفانوں میں چمکنے والی رانی

میں طوفانوں کے لئے کہاں اپنا ہاتھ بڑھاؤں

کناروں پر نسلیں غصّے میں اُبل رہی ہیں

اور طوفانوں کی مشینوں میں ہل چل رہی ہیں

ان طوفانوں میں ہمدم اور ساتھی

قوتِ فیصلہ کھوئے ہوئے سامنے کھڑے ہیں

اور اس طوفان میں

میرے شانوں پر ایک بارِ گراں بن گئے ہیں

(تیسرا گیت)

اب رات بادشاہ کے حرم میں پہنچ چکی ہے

اور دوب پر صرصر گاتی ہیں

اے مرے وطن

اے مرے یروشلم کی آزادی

ماتمی کمرے میں ڈوبتا ہوا چاند

تمہاری موت چمکتی ہے وقت کی شاخوں کے درمیان

میرے گلے میں طوق کی مانند روشن ہے

میرے دیوان کے اوراق پر روشن ہے

میری پہلی محبّت میں اُبھرتا ہے

اے مرے وطن

رات، محبّت کے تیسرے ملک کو اُڑکر پہنچتی ہے

میں جنگ کو نکلتا ہوں سُورج کے ہمراہ

اور موسیٰؑ کی آنکھوں سے پی کر مست ہو جاتا ہوں

میں ہوں سینائی

میں اپنی آواز کا قیدی ہوں

میں جنگ کے لئے کیسے گاؤں اور کیا گاؤں؟

صحرا میرے آگے بچھا ہوا ہے

میں شکست خوردہ شہروں کی راتوں سے گزر جاتا ہوں

میری کُلاہ پر خطابات، سُورج

امن، وادی میں پکار رہا ہے

میں ماضی کا عطر سونگھتا ہوں

میں اپنوں کا ذکر کرتا ہوں

جو ایک ساحل پر طائر کی مانند خوش ہیں

جیسے حاملہ ایّام قتل کے کمروں میں گزرتے ہیں

میں جنگ کو پُوجتا ہوں

کیا تم یہودی ہو

میرے دیوتا خشک سمندروں میں

دُور سے دُور ہو جاتے ہیں

میں اپنے کندھوں پر لنگر اُٹھاتا ہوں

میرے پاس ہواؤں کی بندرگاہ ہے

اور رستم کی نظمیں

میرا کارواں ندیوں سے اُترا ہے

وقت کا سپہ سالار، شاخوں کے پیچھے

عرفات یاسرعرفات

میں انقلاب کی آوازوں میں ڈوبتا ہوں
میں آنکھیں بند کر کے جنگ پر جانا قبول کرتا ہوں
جیسے امن میرے ساتھ ہو

رات سُورج کے بادشاہ کے حضور آتی ہے
جو اپنے وجود سے باہر ہے
میں تمہاری آواز سُنتا ہوں
اے محبّت کے طفل نابالغ
اے عمر ابن الحَتَم
سات روز کی جنگ میں

دریا
عربی زبان اور صحرا سے واقف ہو چکا ہے
میں لوٹتا ہوں اس سُورج کی حضوری میں
چھے دن کی جنگ میں
آزادی کا سُورج

میرے آسمانوں میں نکل آیا ہے

چوتھا گیت

جب انھوں نے میرے شہروں پر حملہ کر دیا
ان کی زبان اور جنگ کی زبان نے
میرے کانوں کو چھید دیا
مگر میں سمندر ہوں
ہمیشہ دُور اور پہنچ سے باہر
شہیدوں کے جزیروں میں

میرے ہاتھ
قاتلوں کو، سانسوں کی دان دیتے ہیں
اور میں ان کے ساتھ
لُٹ پُٹ راہوں پر چلتا ہوں
اپنے ساتھیوں کو پیار کرتا ہوں
جو جنگ سے نفرت کرتے ہیں
جو میرا خون ہیں

میرا وطن ایک آسمان ہے

جہاں طائر اور طیارے پرواز کرتے ہیں

میں بے دلی سے اور ناامیدی سے قتل کرتا رہا

میرے دردِ نہاں نے میری فریاد بند کر دی ہے

میں اکیلا ہو گیا سمندر اور مقتل کے سامنے

جزیرہ ماتموں کو پی گیا ہے

منتظر ہے تلوار کا

تاکہ وہ ندی کو پار کرلے

اور بے ہوش شہروں کو جگائے

جیسے ہوا، تھکے ماندے شہروں میں جان ڈال دیتی ہے

جب وہ میری قوّت کو قتل کرنے لگے

اور میرے بعد مرنے لگے

میں نے محبّت کے ہاتھوں کو پہچانا

جیسے مجبور ہونٹ اعتراف کرلیں

میں وہ ناممکن انسان ہوں

جو وقت سے گزرتا ہے مقتل کی جانب

میں یروشلم ہوں، مقتل بھی

میں محبّت ہوں، مقتل بھی

میں جنگ ہوں، مقتل بھی

میں امن ہوں، مقتل بھی

میں ایک مجرّد نعرہ ہوں

میں یروشلم ہوں

خواہ وہ کہیں بھی ہو

PARTINGS IN MEMOSA.

وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد (غالبؔ)

(انگریزی کی ممتاز شاعرہ راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر کی
طویل نظم کے ترجمے سے کچھ حصّے)

تم تنہا
ایک بُت ہو
جسے مَرمَر تلاش کرتا رہا

جستجو کی روشنی اُتری ہے
لامحدود گہرائیوں میں
جن پر پنجوں کے نشان
خون کی لکیریں اُگلتے ہیں

جہاں موتیا کا کہرا سِسکیاں لیتا ہے

بے رنگ و بو کشتِ خواب پر

دھیرے دھیرے بڑھتا ہے

احساسِ دردِ نہاں

سنگِ بدن میں دھنستا ہے

اپاہج دُکھ تراشتا ہے

درد، آوازوں کے نشتروں کی مانند

شکستہ صلیب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں پر

گِھس گِھس کر تیز ہو جاتا ہے

اور آنسو

آنے والی سحر سے پہلے کی خاموشی کے دامن پر

داغ ہیں

نظر افروز بہاروں کے نشیب و فراز

زر فشاں موجوں پر

ناخدائے وقت کو

آگے بڑھاتے ہیں

ساحل پر جو اُمیدیں

گلِ یاسمین سے چمٹی ہوئی تھیں
جھڑ گئی ہیں
صحنِ آرزو میں
وقت کی دَونے جیسی خوشبو
اُٹھ رہی ہے
دُکھ، صبح کی کہر کے دوش پر
پھر سنْوَرتا ہے
دل کے ہنْسوں کو چھُونے کے لئے
نئی صبح کے بھیس میں
جیون چمک رہا ہے
جنم جنم کی خاک پر
آگے پیچھے
سرگوشی کرتے لمحات
جذبات کے طوفانی سمندروں میں
غوطہ زن ہیں
ماضی کے پھُول کس قدر قریب آ گئے ہیں

سرگوشی چبھتی ہے . . . . .

. . . .

درد جھرّیوں کی مانند
غم کے آتشی رخساروں پر لوٹتا ہے
اور زندگی کی دو دھاری تلوار پر
وقت بِکھر کٹ جاتا ہے
کہسارِ شام وسحر پر
پِیج رس سُرخ عَنبر چھڑکتا ہے
پربتوں کے پاؤں میں
زنجیریں کھنکتی ہیں . . . . .

. . . .

یہ بِکھرا ہوا وقت
وجود کے سایوں سے پہلے
آفرینش کے جھولوں کے قریب پہنچ کر
سنہرے خوابوں کا انتظار کرتا ہے
اور جوانی

آشکار سچائی کے درمیان
توہّم کی کائنات میں
اُمیدوں کے پھُول چُنتے ہوئے
جیون کے شام وسحر کی تنگ راہوں سے نکل کر
اُمیدوں کے بیج کو
خون میں، تن من کی راکھ میں
جستجو کی دَلدلوں میں
بُو دیتی ہے
پیام لنگر انداز ہیں
حروف بے آواز ہیں . . . .

. . . .

دُوریوں کے لمبے پاؤں اب تو کاٹ ڈالو
اگر ہم پھر سے سو جائیں گے
آوازوں کے کھُلنے تک
تو یہ وقت اور سانپ
سازش کرلیں گے

راہیں پھر ڈسنے لگیں گی
ورنہ وقت کی باڑھ
ہمارے اُوپر سے گزر جائے گی
اور نقوشِ قدم کو بھی بہا لے جائے گی
ناشناس پرچھائیوں میں
دونوں کے بوسوں میں
کھو جائے گی . . . . .

. . . .

آج میں
تنہا ہوں
جیسے کوئی دن، موتی کی مانند
اَبَدیت کی مالا سے ٹوٹ کر
الگ ہو گیا ہو
خون کی اک مُردہ آواز
کالی کالی ماتمی زنجیروں میں
آج بھی میرے ساتھ ساتھ روتی ہے

راستہ

سرِ افعی کی طرح
دُور دُور تک کاسنی بھُور پھیلائے ہے
جس پر ہم اندھوں کی طرح ساتھ چلتے ہیں . . . .

. . . .

تم اب دُور ہو کہیں
جہاں موسموں کو زوال نہیں ہوتا
میرے خوابوں کو تم قطرہ قطرہ پیتے ہو
اشک و خون کے ہر دَورِ جام میں پیتے رہے ہو
خواب کی زنجیر ٹوٹتی ہے
جُڑتی ہے
جیسے ہر رات کا پھُول کھِلتا ہے
جیسے حلقۂ شباب میں موسم گھومتے ہیں
جہاں ہماری جُدائی قدم بستہ ہے . . . .

. . . .

ہماری وداع ٹوٹ کر

سرگوشی اور درد کا بوجھ بن جاتی ہے
بے دھار خنجر کے وار کو
ایک نرم چیخ قبول کرلیتی ہے
اور دونوں پتّھر کے بدن سو جاتے ہیں . . . .

. . . .

تم روبرو بھی اور عقب در عقب بھی موجود ہو
یہ دُوری
وقت کے ہونٹ ہیں
جو جُھک کر میرے باطن کو چومتے ہیں
ہزاروں گھنٹیوں کی آوازوں میں
وقت
رخصتی آنکھوں سے جھانکتا ہے

ایک پُرسوز یاد
وقت کی شریانوں میں مچلتی ہے
خواہشوں کی صُبح
نئے جنم کی چٹانوں پر چھلک رہی ہے

اس پرندے کی طرح
جو ایک شب خاک بن جاتا ہے
پھر دوسری شب
اُسی خاک سے
پرندہ بن کر اُڑنے لگتا ہے
دُوریوں کے سینے میں بھی ایک وقت تھا
شجرِ گُل کے سایوں میں
جہاں ہم نے
کسی رات
حیات کے لباس اُتارے تھے
دہانِ زخم پر محبّت کو چوما تھا
اور جیون کو
دودھیا کُہرے کے دامن میں
چھوڑ دیا تھا
اب وہ زعفرانی دُھند لکے میں
طلوع ہوگا

جیسے درد کا سفید طوفان
جو زندگی کے سنگِ در پر
بار بار جبیں گھستا ہے
سحرِ گُل کی میناکاری سے پرے
ہزاروں شاموں کے شہد اور گلابوں سے پرے
بجھتی ہوئی شمعوں کی روشنی سے پرے
ڈھلتی ہوئی شام کے اشاروں سے پرے
گہرے آسمانوں کی سحر سے لوٹو
جہاں زندگی لامحدود گہرائیوں کو چھوتی ہے . . . .

. . . .

میری سانسوں میں خواب بھرے ہیں
اور اُن خوابوں میں ہلچل تب ہوتی ہے
جب تمہاری آمد کے امکانات کی جوت
چھلک اُٹھتی ہے . . . .

. . . .

اب رات کے سائے

چڑھتے بڑھتے

پُر درد نیلی راتوں میں

اپنا حق سمجھ کر

انگلیوں کو بڑھاتے ہیں

میرے کمرے کے دریچوں تک

پھر میرا وقت اور تمہارا وقت

جبڑوں کی مانند ملتے ہیں

تمہارے چلے جانے کے بعد

میں خوابوں کے تصوّر میں کھوئی رہی . . . .

. . . .

پُرانی جدائیوں کے درد

نئی زندگیوں میں

پانی کی باڑھ کی طرح آتے ہیں

یادوں کا سونا

بہتی ہوئی صبا کو روک کر

اس کا مُنہ چوم لیتا ہے

جذبات کی شبنم کو
بے حرکت ریگِ صحرا چوس لیتی ہے

بار بار، سرد طوفانوں میں
اپنے آپ کو اکیلا پاتی ہوں
جس کی ہوس تھی تلاش تھی
وہ تو درد ہے
وقت تُخم بھی ہے اور نمک بھی ہے
جو میموسا کی پہاڑیوں پر سرگوشیاں کرتا ہے . . .

. . . .

چاروں طرف سے
جب گیت دوڑتے ہیں
مجھے احساس ہوتا ہے
کہ یہی تو منزل ہے
مگر، تحسین و آفریں کی صدائیں
بند ہو جاتی ہیں

جب میں تمہیں جاتا دیکھتی ہوں
اور یاد کے سفید کہرے میں
تم کو تحلیل ہوتا ہوا دیکھتی ہوں
جیسے جیون کے ساتوں رنگوں کو
قوسِ قزح کے روپ میں
میں نے لوٹا دیا ہے . . . . .

. . . .

وقت کی بانسری بجتی ہے
وادیوں کی باہوں میں
ایک گونگا درد
سر پیٹتا ہے
وقت کی موسیقی پر
مرثیے اور بِرہ کے گیت روتے ہیں
اور آنسو
ایک لنگڑی اُمید پر گر کر
فنا ہو جاتے ہیں

ہم مر مریں لحدوں میں
حیات ڈھونڈتے ہیں

اور گلِ اشرفی کو گلاب کے دھوکے میں چوم لیتے ہیں
اور پھر حیات کا خنجر
مشاہدہ و احساس میں اُتر جاتا ہے . . . .

. . . .

میں اور تم
وجود کا سامان لائے ہیں سفینے لائے ہیں
بادبان باندھیں گے اور منجدھار سے ساحل تک پہنچیں گے
ہمارے تمام روز و شب صدف میں سو جائیں گے
ریت کے دامن میں ایک دن
وقت
گلابی موتی بن کر جاگے گا

تم مجھے اتنا چاہو میرے محبوب
کہ مجھے کسی اور محبّت کی تمنّا نہ رہے
اور میرے ذہن کے گوشے میں
کوئی آہٹ نہ سُنائی دے
جب تم دُور ہوتے ہو
تو رفو کھُل جاتے ہیں
اور زخم کی آنکھ کچّی ہو جاتی ہے

تُم

(ممتاز تلگو شاعر شری جی سشیشندر شرما نے یہ نظم وینس ڈیمیلو سے متاثر ہو کر
اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء میں بمقام روم کہی تھی)

کچھ تو بولو
میرے دیارِ چشم میں اک خواب
دھنک کی طرح بکھر گیا ہے
دھنک
جو دُور آکاش کے کناروں سے
اُترتی معلوم ہوتی ہے
اُن ہونٹوں کو وا کرو
جو پھُول کی پتّیوں سے زیادہ حسین اور نازک ہیں

اَے حُسنِ بے مثال
میرے معصوم دل کی لہروں میں
وقت کی مہکتی کیاریوں میں
گہری نیند
کتنے یُگ تم سوتی رہیں
گُلاب کھِلے مُرجھائے
خزاں کی نذر ہوئے
لیکن تمہارے نازک چرنوں میں اَرپن ہونے والے
گُلابوں کو لینے کے لئے
کیوں نہیں آئیں

دیارِ روم میں تم کو دیکھا
قدیم فن کی عظمت میں
نقش و نگار کے آئینوں میں
حسین محل کی چوکھٹ پر
درختوں کی شاخوں کے پیچھے

دُور پہاڑیوں کے عقب میں
سایوں کی طرح
ماضی کے نقشِ ناخن کی مانند
تم ایک سَجل شام کی طرح سَنْور کر آئی ہو
اور اپنے سَنگ
لمحۂ گُریزاں کے گلابوں کو
چُرا کر لائی ہو

اے روم کے غروب ہونے والے آفتاب
میری آنکھوں میں
زرد تمنّاؤں کو تم نے
پرت پرت اُتار دیا ہے
جیسے
کسی مائیکل انجلو کے قلم سے
دھنک کے غم انگیز درد
ٹپک گئے ہوں

وہ آنکھیں
نیل گگن کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑے
دو اُودے اُودے پرندے
جیسے دو نیلم
پنکھ لگا کر اُڑ جائیں
میں اُن میں
کہساروں پر گرنے والی برف
اور چاندنی کی ٹھنڈی مہک پاتا ہوں
جہاں مغرب کے کناروں میں ریت پر
انسانی فکر کی برسات ہوتی ہے
میں ان میں سلطنتوں اور شہروں کے
عروج و زوال دیکھتا ہوں
جو صدیوں کے طاقتور شانوں پر
سو گئے ہیں

جب تم کو پایا

تو دنیا کو کھو بیٹھا
نیند کی میٹھی جھیل میں
ایک نازک خواب
ہنس کی طرح بہنے لگا ہے
دُور بہت دُور
میں آسمانوں کے نیلے سنّاٹوں میں کھو گیا تھا
اور جاگا ہوں
اُفق کی باہوں میں
جذبات کے بگولے کی طرح
میرے تخیّل کو تم نے
نئے پنکھ دیئے ہیں
نئی قوتِ پرواز دی ہے
آخر کچھ تو بولو
اس سے پہلے کہ یہ لمحۂ شب
گذر جائے
یہ رات

جس میں
آہیں بھرنے والے گلابوں کی سانسیں
ہم قدم ہیں، ہم نفَس ہیں
کہو، تم کتنی راتیں
نقرئی چاندنی کی موجوں میں
نہا چکی ہو
کہو، بادِ صبا کی کتنی زلفیں
تمہارے مرمریں شانوں کو چومتی ہوئی
اُفق میں گم ہو گئیں
کیا میں تمہارے صندلیں بدن پر
اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں کے نقوش
چھوڑ سکتا ہوں
بس، یہ رات گزر جانے سے پہلے
دل کا بوجھ ہلکا کر ڈالو

کس آذر نے

کتنے پریم نگر
تمہاری آنکھوں میں
تراش ڈالے ہیں
کہو
کیا ان آنکھوں سے
تم دیکھ رہی تھیں
ساگروں کا، شہروں کا نشیب و فراز
جاگتے ڈوبتے سُورج کے رنگین شانوں پر
وقت کا پنچھی اُڑتا رہا، مسکراتا رہا
اُس وقت تم صورتِ سَحَر روشن تھیں
گُلِ یاسمیں کی طرح مہکتی تھیں
کتنے مسافر
اُمیدوں کی رَوِشوں سے گذر گئے
کتنی آنکھوں میں تم نے
نرم، مہین اور ریشمی خواہشوں کے دھاگوں سے
قول و قسم کے نشان

اور اُمیدوں کے نشیمن بنائے
آؤ مجھ سے کہہ ڈالو
اِس سے پہلے کہ وقت کا کارواں
اور آخری رینگتا ہوا لمحہ
میری زندگی کے صحرا کو چھُولے

اِدھر آؤ
تم پتھر نہیں ہو، خواب نہیں ہو
تو کیا تم ماہیِ خوش رنگ ہو
جو میرے پریم جال میں
ہمیشہ کے لئے آگئی ہو
تم ایک حسین حادثے کی جان ہو
جو میری ہزاروں رگوں میں
ایک آنکھ بن کر جاگ رہی ہو
میں کہ جیسے
حادثۂ زندگی نے

ریزوں میں بانٹ دیا تھا
ایک اجنبی لمحے میں
تم نے ان کو یک جان کر دیا
اور میری زندگی پر
سکون کی شبنم برسائی

جب میری دو آنکھوں نے
تم کو پرکھا
اپنے احساس کی اَن گنت اُنگلیوں سے چھُوا
تو تم نے
میری کوتاہیِ دامن میں
سونے کے خزانے لُٹا دیئے
عشق اگر جیون کی مٹھاس ہے
تو عاشق ایک پھول ہے
میں وہ پھُول ہوں
جسے تمہاری انگشتِ حنا بستہ نے کھِلایا ہے

تمہاری باہیں
کھیتوں پر رقص کرتی ہوئی چاندنی کی مانند

ملائم ہیں
مجھ پر ان باہوں میں کیا گزری
تو سنو

جیسے اوّل اوّل
لپکتی ہوئی اگنی نے رشیوں کو گیت دیئے تھے
میں ایک کرن کی تلاش میں
ایک نغمے کی لکیر پیٹتا ہوا
تم تک پہنچا ہوں
صدیوں کی شعاعوں میں

نہاتا ہوا

اپنے آپ تک پہنچا ہوں

(ترجمہ)

نذرِ وطن

اندرا جیوتی

آزادیِ وطن

بانڈڈیلر

حیاتِ سادات

ایک خواب — ایک حقیقت

پٹنہ جو ایک شہر تھا بھارت میں انتخاب

مخدوم

اِندرا جیوتی

(شریمتی اندرا گاندھی کے نام)

ہر طرف گہری سیاہی چھا گئی ہے کیا کروں
بھوک کی' افلاس کی اور جہل کی' بے روزگاری کی
اور استحصال مذہب کا' زباں کا
بدترین ہنگام
استعمالِ بے جا' خامۂ بے روشنائی کا
اور کلیدی عہدے اپنانے کا لالچ
خرد کے ذہن میں بیٹھے ہیں ناگ
ہاتھ میں شمشیر' آنکھوں میں ہیں شعلے

ہر طرف گہری سیاہی چھا گئی ہے

یا پھر ایسا ہے میں اَندھا ہوگیا ہوں
اِندرا جیوتی،
تنگ ذہنی کے، تعصّب کے، تشدّد کے
لبادوں کو جَلا دے
اور ہم کو
بَرق آسا اک معطّر چاندنی
کر دے عطا
جِس کی ضَو میں
مُسکرائے مہکے
بھارت کی جوانی کا گلُاب

۱۹۷۳ء

آزادیٔ وطن

یہ ماہ و انجم کی بارگاہیں
شمیمِ گُل، جانِ نغمہ
یہ چاندنی کی سُپردگی بھی
یہ نوجوانی کی سرشارگیں بھی
دیارِ مغرب کے خونی ہاتھوں سے اپنی گردن
چُھڑا رہی تھیں
گلابی چادر زمیں پہ بچھ کر
دھنک کا آنچل فلک پہ اُڑ کر
وطن کو آزادیٔ وطن کی بشارتیں
جیسے دے رہا تھا

وطن کی دھرتی کے ہونٹ پھیلے

یہ ہونٹ پیاسے تھے
اپنے بچوں کی شہ رگوں کو
تراش کر اُن پہ جم گئے تھے
سِیاہ لب خون پی رہے تھے
سفید لب مُسکرا رہے تھے
سفید ہونٹوں کی مسکراہٹ
بس ایک لمحے میں چیخ بن کر
سُکوت کی برف پی رہی تھی
اَنا کا سُورج پگھل رہا تھا
محیطِ عالَم کی تابناکی
رِدائے مغرب میں گِر کے
لمحہ بہ لمحہ تحلیل ہو رہی تھی

سلونی شامیں
نگارِ مشرق کے گیسوؤں میں

مچل رہی تھیں

کہ شانہ اُٹھے

کہ مانگ نکلے

کہ برق چمکے

تو راستے کی لکیر پیٹیں

شعور کھوجیں، ضمیر ڈھونڈیں

خرد کی ڈھالیں

جنوں کی شمشیریں لے کے اُٹھیں

نگر نگر فتح کریں

وطن کو

محرومیوں سے، سازش سے

پاک کریں

۱۹۴۸ء

بانڈڈ لیبر (BONDED LABOUR)

(تحت معاہدہ استحصال مزدوری)

سَوا سیر گیہوں کے بدلے
دس ایکڑ کا کھیت دیا
سات دَہوں تک کر کے غلامی
دو سو رُوپے اصل تھے باقی
پہلے رہن تھا سونا چاندی
بعد میں تانبا پیتل
اس کے بعد انسانوں کی باری آئی

محنت کے ہاتھوں میں
زنجیریں پہنا دیں
محنت رہن ہوئی

بھارت کے یہ ناگ
اپنے سیہ پھنوں کو
لوہے کی، موٹی، کالی تجوریوں میں
چُھپا رہے ہیں
بیس نکاتی فارمولے کا چوتھا خنجر
اِن کے پھنوں میں
زہریلے زخموں کے سِکّے
بھرنے والا ہے
یہ لو، سونے چاندی کی جلتی سُرخ سلاخیں
اِن کو اپنے منہ میں رکھ لو
اِن سے اپنی آنکھیں سینکو
ہاتھوں کو تاپو
پیٹ بھرو

۱۹۷۶ء

حیاتِ مُساوات

جو لوگ قوم کے دشمن ہیں، ملک کے دشمن
چھپائے تیغ قبا میں، جُھکی ہوئی گردن
دلوں میں بُغض ہے، لیکن کلام کرتے ہیں
شکن جبیں کی دکھانے سلام کرتے ہیں
بنامِ مذہب و اخلاق، گُل کِھلاتے ہیں
زباں کے نام پہ انساں کا خوں بہاتے ہیں
فلک کو چھونے اُٹھے ہیں، حقیر بَونے ہیں
میں جانتا ہوں یہ ٹوٹے ہوئے کھِلونے ہیں

دل کی جگہ ہیں سینوں میں روٹی کے ٹکڑے
ہونٹوں پر روٹی کے ٹکڑے
آنکھوں میں روٹی کے ٹکڑے
دل کے ٹکڑے
چال سے استقلال نمایاں
ذہنوں میں ہیں
مستقبل کے، مُبہم مُبہم خوابِ پریشاں
خوابِ پریشاں، ایک حقیقت، دورِ محبّت، دورِ اُخوّت
دھرتی پر مزدور حکومت
ظُلمت میں پُرنور حکومت

۱۹۷۰ء

پٹنہ جو ایک شہر تھا بھارت میں انتخاب

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو عزیز جان کے، بھیا پکار کے
پٹنہ جو ایک شہر تھا بھارت میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
غرقاب کر کے سون نے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے
جیتے ہیں، بس گزرتے ہیں دن انتظار کے
رات اختیار کی ہے، نہ دن اختیار کے

نقدی بھی بہہ گئی ، بہے کھاتے اُدھار کے
"گُر" سارے ہم تو بھول گئے کاروبار کے
لٹکے ہوئے ہیں دیکھو، درختوں پہ سارے لوگ
سارے مکان بہہ گئے قُرب وجوار کے
بھوکے ہیں کب سے ہم کو تو کچھ یاد بھی نہیں
لمحے رُکے پڑے ہیں ہمارے دیار کے
کس کس طرح سے ٹوٹیں گے باغوں کے والیاں
بہتے ہوئے کچھ آئے ہیں، دانے انار کے
ہے یاد مجھ کو میں نے اُسے دی تھیں گالیاں
بھوکی بھکارن آئی تھی' دامن پسار کے
بیٹھی ہے وہ مزے سے تناور درخت پر
کھاتی ہے کھول کھول کے ڈبّے تُشار کے
ڈبّوں میں سوکھی روٹیاں، آچار ، دال بھی
یہ "نعمتیں" کہاں سے وہ لائی تھی مار کے
آنکھوں میں آنسو آئے، مرے کپکپائے لب
روٹی کا ٹکڑا مانگا جو مَیں نے پکار کے

آچار ہیں بھگوئے ہوئے نرم چار توس
تحفے غریب کے تھے، محبّت کے، پیار کے

وہ ہنس کے بولی، بھوک میں کیا کام آئے گی
ہیرے کی، میں نے دی جو انگوٹھی اُتار کے

بھوکوں کو دیکھیو نہ حقارت سے صاحبو
اُن کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

عالِم کے، جاہلوں کے، غریبوں کے، سیٹھ کے
بھگوان ایک کے نہیں، وہ تو ہیں چار کے

ہر شہر میں ندی کی ہے ناگن پڑی ہوئی
پیتی ہے بادلوں کو فلک سے اُتار کے

غصّے میں آ کے زہر کے طوفاں اُگلتی ہے
لُٹتے ہیں جب غریب کسی بھی دیار کے

لہجہ نظیر کا ہے، زمیں میر کی غیاث
پٹنہ میں کھینچ لائیں گے ہم دن بہار کے

مخدوم

دوست روتے ہی رہیں گے بخدا تیرے بعد
لبِ دشمن پہ تبسم نہ مِلا تیرے بعد
تو نہیں ہے تو ہر اک غیر نظر آتا ہے
کِس کو پہچانے غیاثؔ اپنے سِوا تیرے بعد

۱۹۷۳ء